دَورِ جدید کا علمی چیلنج اور اُس کا حل

تحریر: مولانا غلام اللہ خان حقانی

آج جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں دورِ جدید کہلاتا ہے۔ یہ دَور مغربی فکر و فلسفہ اور علوم وفنون کی بالادستی کا دَور ہے۔ مغرب کے فلاسفہ' حکما اور علماءِ سائنس نے دو تین سو سال پہلے خُدا' کائنات' انسان' زندگی اور دنیا کے متعلق ایسے نظریات دیے جن سے انسان کا فکری مزاج تبدیل ہوا۔ قرآن مجید میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ (بنی اسرائیل: ۸۴) ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ ہر انسان اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے''۔ اُس کا شاکلہ یعنی فکری مزاج اگر ضلالت پر مبنی ہے تو وہ لامحالہ ضلالت کے کام کی طرف مائل ہو گا۔ اور اگر اُس کا شاکلہ' شاکلۂ ہدایت ہے تو اُس سے صحیح اعمال کا صدور ہو گا۔

اسلام کے ظہور سے پہلے انسانوں پر شاکلۂ ضلالت کا غلبہ تھا۔ اُن کا یہ شاکلہ مشرکانہ عقائد کے تحت بنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ نے اپنی غیر معمولی جدوجہد سے اس شاکلۂ ضلالت کو توڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شاکلۂ ہدایت کا دَور شروع ہوا۔ اس دور میں انسان کے فکری مزاج کا مرکز و محور خُدا بنا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ کائنات کے سارے واقعات ایک خُدا کے حکم سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اور خُدا کا یہی تصور انسانی اعمال کی تشکیل کرتا تھا۔ اُس دور کو ہم دورِ قدیم کہتے ہیں جو اٹھارہویں صدی تک قائم رہا۔

اس کے بعد ایک نیا عہد شروع ہوا جس میں شاکلۂ انسانی دوبارہ تبدیل ہوا۔ اب انسان کے فکری مزاج کا مرکز و محور خُدا کے بجائے فطرت (nature) بنا۔ انسان کو یقین دلایا گیا کہ کائنات کے تمام واقعات کچھ قوانین کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں' لہٰذا کسی غیر مرئی خُدا کا تصور کرنا سراسر حماقت ہے۔ غالباً یہی وہ دور ہے جس میں اکبر الٰہ آبادی نے اس فکر کے غلبے کو دیکھ کر یا بالفاظِ دیگر اُس شاکلۂ انسانی کو تبدیل ہوتا ہوا محسوس کر کے کہا تھا:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خُدا کا اِس زمانے میں!

جب شاکلۂ انسانی تبدیل ہوا تو اب اقوامِ عالم مجبور ہیں کہ وہ اس طرح سوچیں جس طرح اہلِ مغرب سوچتے ہیں اور زندگی گزارنے کے وہ طریقے اپنائیں جو اہلِ مغرب نے اپنائے ہیں۔ اس تبدیلی کو بھی بڑے واضح انداز میں اکبرالٰہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے:

جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے
نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا دماغ میرا
خیال اُن کا زبان میری

اس دورِ جدید کو برپا کرنے اور شاکلۂ انسانی کو تبدیل کرنے میں ایک لمبی مدت اور سینکڑوں اشخاص کا عمل شامل ہے۔ تاہم علامتی طور پر تین شخصیات کے فکر و نظر نے اس تبدیلی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں نمایاں ترین شخصیت جسے دورِ جدید کا بانی کہا جاتا ہے' سر آئیزک نیوٹن ہے جس کا زمانہ ۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء ہے۔ نیوٹن نے کائنات کے چھوٹے بڑے واقعات اور نظامِ شمسی وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ اُس نے ثابت کیا کہ سورج' چاند اور سیارے قانونِ تجاذب (Law of Gravitation) کی وجہ سے خلا میں حرکت کر رہے ہیں۔ نیوٹن نے دریافت کیا کہ کائنات کے تمام واقعات قوانینِ فطرت کے تحت رونما ہو رہے ہیں جس کو علم الحساب کی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ اُس سے پہلے گلیلیو نے سولہویں صدی میں دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ:

"The book of nature is written in the form of mathematics."

یعنی فطرت کی کتاب سب کی سب ریاضی کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ نیوٹن نے اٹھارہویں صدی میں اس فکری عمل کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ نیوٹن کی ان تحقیقات کی اشاعت نے پورے انسانی عقیدہ کو متزلزل کر دیا۔ اسی کی بنا پر جدید مفکرین نے قدیم دَور کے راسخ شدہ عقائد کے خلاف یہ اعلان کیا:

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

یعنی واقعات اگر فطرت کے اسباب کے تحت پیش آتے ہیں تو وہ مافوق الفطرت اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔

نیوٹن کے بعد مفکرین کے جس گروہ نے جدید شاکلۂ انسانی کو بنانے میں اہم کردار ادا کیا

اس گروہ میں نمائندہ شخصیت چارلس ڈارون (۱۸۰۲ء تا ۱۸۸۲ء) کی ہے۔ نیوٹن نے جس طرح طبیعی دنیا (Physical World) کو قانونِ فطرت کے تحت حرکت کرتے ہوئے دکھایا تھا اسی طرح ڈارون نے بتایا کہ حیاتیاتی دنیا (Biological World) بھی قانونِ فطرت کے تحت سفر کر رہی ہے۔ ابتدائی جرثومہ سے لے کر انسان تک جتنے بھی حیاتیاتی مظاہر اس دنیا میں دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب معلوم قانونِ فطرت کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔ اس نظریہ کے نتیجہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ساری دنیا میں یہ ذہن بن گیا کہ انسان کی تخلیق کا خالق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تخلیق اُس قانونِ فطرت کی مظہر ہے جس کو عام طور پر ارتقاء (evolution) کہا جاتا ہے۔

نیوٹن اور ڈارون کے بعد جس شخصیت نے انسانی شاکلہ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا وہ ہے کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء)۔ وہ قدیم انسانی تاریخ کو تقدیر کا کرشمہ سمجھتا تھا کہ ایک بزرگ اور برتر خُدا ہے جو تاریخی واقعات مثلاً قوموں کے عروج و زوال، تہذیب و تمدن کا بننا اور مٹنا وغیرہ کو تشکیل دیتا رہتا ہے۔ مارکس نے آ کر انسانی تاریخ کے سفر کا ایک مادی فلسفہ پیش کیا جسے اُس نے تاریخ کی علمی تعبیر کا نام دیا۔ اُس نے کہا کہ: ''تاریخ میں خود اُس کے اپنے اندرونی قانون کے تحت طبقاتی جدوجہد جاری رہتی ہے، اور یہی طبقاتی جدوجہد تاریخ کے حال اور مستقبل کی صورت گری کرتی ہے''۔ مارکس کے اس فلسفے اور اس کی بنیاد پر پیدا ہونے والے بے شمار لٹریچر نے ساری دنیا کے انسانوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر کیا۔ لوگ تاریخ کو ایک غیر خُدائی واقعہ کی نظر سے دیکھنے لگے، جبکہ اس سے پہلے لوگ اسے خُدائی واقعہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بہرحال آج پورے کرۂ ارضی پر یہی افکار و نظریات اور تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا تین سو سال پہلے یورپ میں ہوئی تھی۔ یورپ میں اس حوالے سے فلسفہ کے جتنے بھی مقبول مدارس وجود میں آئے ہیں اُن کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اور عقل کی گرفت میں نہ آئے اُس کے وجود پر یقین کرنا مناسب نہیں۔ چونکہ خُدا، روح اور حیات بعد الممات تینوں غیر محسوس ہیں لہٰذا اِن کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے۔ اس فکر نے انسانی زندگی کے تمام عملی نقشوں کو یکسر بدل دیا، حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اپنے آپ کو کٹر مذہبی خیال کرتے ہیں، اُن کے مشاغل اور سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ بھی سورۃ البقرۃ کی آیت ۸ کا مصداق ٹھہرتے ہیں جس میں فرمایا گیا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ

اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸﴾ ''لوگوں میں سے بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' حالانکہ وہ مؤمن نہیں''۔ اس لیے کہ یہ ایک فکری طوفان ہے جس سے اپنے آپ کو بچانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

یہ تو فکر ونظر کی بنیاد پر ایک فلسفیانہ بحث تھی۔ عملی اعتبار سے اس Scientific Phenomenon کے ذریعے تاریخ انسانی میں پہلی بار طاقت کے معیار کو بدل دیا گیا' وہ معیار جس سے پچھلے دور کا انسان ناواقف تھا۔ اس لیے کہ تاریخ کے پچھلے ادوار میں فریقین کے مابین زیادہ تر کمیت کا (quantitative) فرق ہوا کرتا تھا' اب اہل مغرب نے ایسا دور تخلیق کیا جس میں اُن کے اور اُن کے مخالفین کے درمیان کیفیت کا (qualitative) فرق پیدا ہوگیا۔ اس تبدیلی نے مغرب کو دوسری قوموں پر فیصلہ کن اور واضح برتری دے دی۔ اس لیے کہ اگر فریقِ اوّل کے پاس دست کاری کی صنعت ہے اور فریق ثانی کے پاس مشینی صنعت ہے' اگر فریق اوّل بحری سفر کے لیے بادبانی کشتی استعمال کرتا ہے اور فریقِ ثانی دُخانی کشتی استعمال کرتا ہے' اگر فریقِ اوّل کے پاس دستی ہتھیار ہیں اور فریق ثانی کے پاس سیٹلائٹس کا پورا نظام اور دُور مار ہتھیار موجود ہیں' اگر فریقِ اوّل خشکی کے سفر کے لیے حیوانی قوت سے کام لے رہا ہے اور فریقِ ثانی سواری کے لیے انجن کی قوت استعمال کرتا ہے تو فریقِ ثانی کو فریقِ اوّل پر ایک واضح اور فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ فکر ونظر' علوم وفنون اور معیارِ قوت کی اس تبدیلی نے دنیا کے اندر عملی اعتبار سے جس تہذیب وتمدن کو رواج دیا ہے اُس میں نہ خُدا کا ذکر ملتا ہے اور نہ روح وآخرت کا۔ اس لیے کہ خُدا' روح اور آخرت جس شاکلۂ انسانی کے اَبعادِ ثلاثہ تھے وہ شاکلہ ہی توڑ دیا گیا ہے۔ اب ایک نیا شاکلۂ انسانی ہے اور اس کے اپنے اَبعاد (dimensions) ہیں۔ اس وقت جس تہذیب وتمدن کا پورے کرۂ ارضی پر ڈنکا بج رہا ہے یہ وہ تہذیب وتمدن ہے جسے مغربی دنیا ''نیو ورلڈ آرڈر'' (New World Order) کا نام دیتی ہے۔ یعنی ''دنیا کے لیے ایک نیا نظامِ زندگی''۔

اس تہذیب کا اگر ہم جائزہ لیں تو اس کے جو نمایاں اوصاف ہیں ان میں پہلا وصف آزاد خیالی ہے۔ آزاد خیالی کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اپنی سوچ' اپنے اختیار' اپنی فکر اور اپنے عمل میں آزاد ہے۔ وہ جو چاہے سوچ سکتا ہے اور جو چاہے بول سکتا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خُدا کا بیٹا کہے یا نعوذ باللہ انہیں ولدِ زنا قرار دے' وہ آزاد ہے۔ یہود نے اس پر پوری فلم بنائی ہے جس میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو سیدہ مریم علیہا السلام کے منگیتر جوزف

کارپینٹر کا حرامی بچہ قرار دیا ہے جس سے ابھی حضرت مریم ﷤ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔اس لبرل ازم کے حوالے سے ہم سے مغرب کا مطالبہ ہے کہ سلمان رشدی نے اگر Quranic Verses کو Satanic Verses کہا ہے یا اگر قادیانی نبوت کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو یہ تو آزاد خیالی کا تقاضا ہے' تم کو برداشت کرنا چاہیے۔تم نے قادیانیوں کو اپنے قومی وجود سے کاٹ پھینکا' یہ جدید تہذیب کے سراسر خلاف ہے۔ ہر شخص کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے۔ بلکہ اِس پوپ نے جو ابھی چل بسا ہے' یہ فتویٰ دیا تھا کہ توہینِ رسالت کے قانون میں مسلمانوں کو ریلیف دینا چاہیے۔

اس عالمی تہذیب کا دوسرا نمایاں وصف سیکولرزم ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہے لادینیت + ہمہ مذہبیت۔ سیکولرزم انسانی زندگی کو دو گوشوں میں تقسیم کرتا ہے: انفرادی گوشہ اور اجتماعی گوشہ۔ انفرادی گوشے کو وہ مذہب کہتے ہیں جس میں ہر شخص کو تین چیزوں میں آزادی حاصل ہوتی ہے: عقیدہ' عبادات اور رسومات۔یعنی انسان اپنے عقیدے میں آزاد ہے۔ وہ چاہے ایک خُدا کو مانے یا لاکھوں کو' پتھر کو سجدہ کرے یا سورج اور ستاروں کو' وہ اس میں آزاد ہے۔ انسان عبادات میں آزاد ہے۔ وہ خُدا کو خوش اور راضی کرنے کے لیے چاہے مسجد میں آئے یا چرچ اور مندر میں' اُسے آزادی ہے۔اسی طرح انسان رسومات میں آزاد ہے۔غم اور خوشی کے موقعوں پر وہ اپنے عقیدے کے مطابق جو بھی کرے اُسے آزادی ہے' چاہے وہ بچے کی پیدائش پر اس کے کان میں اقامت اور اذان کہہ دے یا اس موقع پر ناچ گانے کی محفل منعقد کرے' فوت ہونے پر مُردے کو چاہے تو دفن کرے اور چاہے تو اُسے آگ میں جلائے۔

سیکولرزم کی رو سے انسان کی زندگی کا دوسرا گوشہ اس کی اجتماعی زندگی ہے' یعنی سیاسی نظام' معاشی نظام اور معاشرتی نظام۔ان اجتماعی گوشوں سے مذہب کا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ سیاسی نظام ہو یا معاشی نظام' معاشرتی نظام ہو یا عائلی نظام' یہ بنیں گے لوگوں کی صوابدید پر۔ لہٰذا سیاسی نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی' جمہوریت ہوگی یا مارشل لاء' اس میں عقیدے اور عبادات کی طرح اُس خُدا سے نہیں پوچھا جائے گا۔ معاشی نظام کیا ہوگا؟ سود اور جوئے پر مبنی ہوگا یا لاٹری اور پرائز بانڈز پر' عوام اس کا فیصلہ کریں گے' کسی خُدا یا بھگوان سے نہیں پوچھا جائے گا۔معاشرتی نظام کیا ہوگا؟ مخلوط معاشرہ ہوگا جہاں خواتین اور مَرد ایک ساتھ رہیں گے یا پردے کا نظام ہوگا' مخلوط تعلیم (Co-education) ہوگی یا بچے اور بچیوں کے لیے الگ

الگ ادارے قائم کیے جائیں گے' یہ لوگوں کی صوابدید پر ہوگا' کسی مذہب سے نہیں پوچھا جائے گا۔ دوسری بار صدر بش جب منتخب ہوئے ہیں تو اُنہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان کیا ہے کہ:

"We are ready to embrace Islam as a religion but we can not accept Islam as a politico-socio-economic system."

یہ سیکولرزم اس بے خُدا تہذیب کا دوسرا بڑا وصف ہے کہ اَن دیکھے خُدا کی superiority کو توڑ دو' تاکہ دنیا ترقی کرے اور لوگوں کو آزادی مل جائے۔ پھر سیکولرزم کا سیاسی نظام جمہوریت ہے جو اوّل تا آخر خُدا کی نفی پر مبنی ہے۔ اگرچہ لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ جمہوریت نام ہے عوام کے حقوق اُن کے دروازوں تک پہنچانے کا' لیکن جمہوریت ملوکیت' ڈکٹیٹرشپ اور بادشاہت سے بڑھ کر ایک ابلیسی ہتھکنڈہ ہے۔ بقول اقبالؔ:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن ' اندروں چنگیز سے تاریک تر!

چنانچہ جمہوریت غلامی کی بدترین شکل ہے۔ یہ آزادی کی آڑ میں غلامی کی ایسی شکل ہے جو انسان کے جملہ قویٰ اور صلاحیتوں کو مفلوج بنا دیتی ہیں۔ بقولِ اقبالؔ:

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

بہرحال سیکولرزم کا سیاسی نظام جمہوریت ہے' جبکہ اس کا معاشی نظام سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام ہے جس نے اِس وقت ساری دنیا میں بے روزگاری' مہنگائی' کرپشن' حرام خوری' فحاشی وعریانی' خون خرابہ اور دنگا فساد برپا کیا ہوا ہے۔ تہذیب جدید کا اس دنیا کے بارے میں تصور یہ ہے کہ دنیا بس یہی دنیا ہے' آگے کوئی اور دنیا نہیں' لہٰذا یہاں جتنی سہولتیں اور لذتیں ہیں اُن کو حاصل کیا جائے۔ آج consumerism کا یہ جذبہ تقریباً تمام انسانوں میں موجود ہے جس نے اِس خطرناک صورت حال سے انسان کو دوچار کیا ہے کہ ہر قسم کی لذت پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ آخر جنسی جذبہ انسان کے اندر ہے تو اُسے حق حاصل ہونا

چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اس جذبے کی تسکین کرے۔ دو عورتیں مل کر اگر تسکین حاصل کر سکتی ہوں تو کریں۔ دو مَرد مل کر اگر لذّت حاصل کر سکتے ہوں تو اُن پر پابندی نہ ہو۔ یہ تو پیاس جیسا جذبہ ہے' گلاس ملے تو اُس سے پانی پی لیا جائے' کٹورا مل جائے تو اس سے پیاس بجھالی جائے' برتن نہیں ملا تو اوک لگا کر پانی پی لیا جائے' اس میں کوئی لمبے چوڑے قواعد و ضوابط اور اخلاقیات کی بحث کی ضرورت نہیں۔ ماں بہن اور اپنے پرائے کی لوگوں نے مصنوعی قدغنیں لگادی ہیں' اُن کو ختم ہو جانا چاہیے۔

یہ ہے آج کے دور کے انسان کا شاکلۂ جدیدہ۔ آج اس کا فکری مزاج اُس کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا راستہ اختیار کرے۔

مذہب اور سائنس دونوں وسیع موضوعات ہیں۔ مجھے یہاں سائنس یا مذہب کی تفصیلات پر کچھ نہیں لکھنا۔ اس تحریر کا موضوع دراصل سائنس کے اس پُر زور دعوے کی وضاحت کرنا ہے کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے' یا سائنس کا یہ دعویٰ کہ قوانینِ فطرت کی دریافت کے بعد خُدا کو ماننے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم انسان سمجھتا تھا کہ ایک بزرگ اور برتر ہستی یعنی خُدا ہے جو اس کائنات کے جملہ اُمور کو سرانجام دے رہا ہے۔ قدیم انسان نے یہ رائے اس لیے قائم کی تھی کہ اس کے بغیر اِن اُمور کی توجیہہ کسی اور طریقے سے ممکن نہ تھی۔ مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ سورج کو کون نکالتا ہے؟ قدیم انسان مجبور تھا کہ وہ کہے کہ اللہ! لیکن جب سائنس نے دریافت کیا کہ اس کائنات میں ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جس کو تجربہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے' Physical World ہو یا Biological World' یہ کچھ قوانین کی پابندی سے رواں دواں ہیں' سورج کو نکالنے والا اللہ نہیں ہے' بلکہ ''Law of Gravitation'' (جذب و کشش کا قانون) ہے جو اِس عمل کے پیچھے کارفرما ہے' سمندری طوفان اللہ کے حکم سے نہیں آتا' بلکہ یہ تو چاند کی کشش (Gravitational Pull) اور دنیا کی جغرافیائی وضع و ہیئت (Geographical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے تو انسان کی اس سوچ اور رائے میں تزلزل پیدا ہوا۔ ان قوانین کی دریافت کے بعد یورپ کے فلاسفہ اور حکماء نے بڑے بڑے دعوے کیے۔ مثلاً جرمن فلسفی کانٹ نے کہا کہ مجھے مادہ مہیا کرو تو میں تمہیں بتادوں گا کہ دنیا اس مادے سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔ ہیکل (Haeckle) نے دعویٰ کیا کہ پانی' کیمیاوی اجزاء اور وقت ملیں تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ نٹشے نے اعلان

کر دیا کہ اب خُدا مر چکا ہے۔

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید تصور کی رو سے کائنات کے تمام اُمور قوانینِ فطرت کے ذریعے وقوع پذیر ہو رہے ہیں' لہٰذا کسی اَن دیکھے خُدا کا تصور سراسر حماقت ہے۔ سائنس کی بنیاد پر بننے والے اس نظریے کو اگر ہم ایمان بالتجربہ والشہود سے تعبیر کریں تو بے جا نہ ہوگا' جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شے مشاہدہ اور تجربہ یا حواسِ خمسہ اور عقل کی گرفت میں آ جائے اُس پر یقین کیا جائے اور جو شے اس معیار پر پوری نہ اُترے اُس کا انکار کر دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں مذہب کی تعلیم ایمان بالغیب کی تعلیم ہے۔ یعنی اس کائنات کا خالق اور مدبر ایک غیر مرئی خُدا ہے' لہٰذا اس پر ایمان لایا جائے اور کائنات میں رونما ہونے والے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ نظریہ اللہ کے پیغمبروں نے لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اُس وقت کے انسانوں نے اس پر شک وشبہ کا اظہار کیا تو اپنے مخاطبین کے سامنے اللہ کے پیغمبروں نے اپنے اس دعویٰ پر یہ عقلی دلیل پیش کی کہ: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ (ابرٰھیم:۱۰) ''کیا تمہیں اُس خُدا کے بارے میں شک ہے جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے؟'' دلیل کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ تمہارا یہ شک اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس وسیع وعریض کائنات اور اس کے اَن گنت پھیلے ہوئے ظواہر ومظاہر مشاہداتی سطح پر اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ واقعی اس کائنات کے جملہ اُمور کا سرانجام دینے والا خُدا ہے۔ پیغمبروں کا زمانہ سائنس کا زمانہ نہ تھا' اُس زمانے میں انسان کائنات کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ آج کائنات کے بارے میں انسان کے علم میں کروڑوں گنا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کل جبکہ انسان شعور کی اس پختگی اور علم وفنون کے اس کمال تک نہیں پہنچا تھا' تو وہ اس نظریے کو قبول کرنے پر جتنا مجبور اور محتاج تھا' آج کا انسان بھی شعور کی پختگی اور علوم وفنون کے کمال پر پہنچنے کے علی الرغم اتنا ہی مجبور اور لاچار ہے کہ اس نظریۂ کے سامنے جھک جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید تحقیقات نے اس نظریے کی صداقت کو اور زیادہ واضح انداز میں ثابت کیا ہے۔ چنانچہ جدید مفکرین کا قول ہے کہ یہ کائنات حد درجہ محکم اور منظم ہے اور ہر آن ایک محرک اور منتظم کی طالب ہے۔ غالباً اس خاص پہلو سے برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینز (Sir James Jeans) اپنی کتاب ''The Mysterious Universe'' (مطبوعہ ۱۹۴۸ء) کے صفحہ ۱۲۳ پر خالص سائنسی

نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آج ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو طبیعی سائنس کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ علم کا دریا ایک ''غیر مشینی حقیقت'' (Non Mechanical Reality) کی طرف چلا جا رہا ہے۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے خیال (Great Thought) سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ذہن (mind) اتفاقاً محض ایک اجنبی کی حیثیت سے اس مادی دنیا میں وارد نہیں ہوگیا ہے۔ اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ہم اُس ذہن کا اس عالم مادی کے خالق اور حکمران کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے' بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے اُن خیالات پر نظرِ ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لیے تھے۔ ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمران (Controlling or designing power) کی شہادت دے رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ مشابہ ہے' جذبات و احساسات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس طرز پر سوچنے کے اعتبار سے جس کو ہم ''ریاضیاتی ذہن'' (Mathematical Mind) کے الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں۔''

مغربی مفکرین' فلاسفہ اور علماءِ سائنس کا یہ دعویٰ کہ کائنات کچھ لگے بندھے قوانین کے تحت حرکت کر رہی ہے' کوئی خُدا نہیں جو اِس کو حرکت دے رہا ہے' اُس وقت بھی علمی اعتبار سے نہایت کمزور تھا اور اب بھی خود سائنس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لیے اطمینان بخش دلائل موجود نہیں ہیں۔ ایک عیسائی عالم کا قول ہے:

"Nature does not explain, she is himself in need of an explanation."

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی' وہ خود اپنے لیے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔ وہ آگے لکھتا ہے: ''Nature is a fact not an explanation.'' کہ فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے' اس کو کائنات کی توجیہہ نہیں کہا جا سکتا۔ گویا مخالفینِ مذہب جن سائنسی دریافتوں کو فطرت کی توجیہہ کا نام دے کر اس کو خُدا کا بدل ٹھہرا رہے ہیں اسے ہم فطرت کا طریقۂ کار کہہ سکتے ہیں' یعنی خُدا اِن ہی قوانین کے ذریعے کائنات میں اپنا عمل کرتا

ہے۔ ان قوانین میں سائنس اگر کسی قانون کو دریافت کرتی ہے تو اس قانون کو خُدا کا بدل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مثلاً سائنس نے دریافت کیا کہ جوار بھاٹا یا مدّ و جزر یعنی سمندر میں پانی کا اُتار چڑھاؤ درحقیقت چاند کی کشش اور دنیا کی جغرافیائی وضع و ہیئت کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ طوفان قوتِ کشش اور زمین کی جغرافیائی وضع و ہیئت کی وجہ سے آتا ہے' لیکن اس سے ہمارے عقیدے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا' اس لیے کہ قوتِ کشش اور جغرافیائی بناوٹ بھی تو خُدا کی مخلوق ہیں اور وہ اِن ذرائع سے اپنا فعل سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ طوفان کا حقیقی سبب یہ قوانین نہیں' بلکہ اس کا حقیقی سبب خُدا ہی ہے۔ جان ولسن اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''Philosophy & Religion'' (مطبوعہ ۱۸۶۱ء لندن) کے صفحہ ۳۶ پر لکھتا ہے:

> *"This does not destroy my belief. It is still God, working through these things, who is responsible for the tides."*

اس میں یہ نکتہ نوٹ کرنے کا ہے کہ ان قوانین کو دریافت کرنے والے سائنس دانوں کا یہ منشا نہیں تھا۔ مثلاً نیوٹن نے کہا تھا کہ یہ خُدا کا طریقۂ کار ہے' یعنی خُدا اسباب و علل (causes and effects) کے ذریعے کائنات میں اپنی منشا پوری کر رہا ہے۔ لیکن اِن قوانین کے دریافت ہوتے ہی جو فلاسفہ اور مفکرین تھے انہوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لے کر یہ دعویٰ کیا کہ یہ دریافت خُدا کا سائنسی بدل ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو اِن سائنسی دریافتوں کی روشنی میں فلسفے کی تشکیل کر رہے تھے۔ لہٰذا جب اُن کو اسی کے اندر الحاد کا ثبوت ملا تو انہوں نے اس کی بنیاد پر ایک پورا نظامِ فکر بنا ڈالا۔ مگر اُن مفکرین کی یہ خوشی زیادہ دیر باقی نہ رہی' اس لیے کہ سائنس کے علم میں ایسے بہت سے حقائق سامنے آئے ہیں جو اِس قسم کی تعبیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً ریڈیم ایک تابکار عنصر ہے۔ اس کے الیکٹران خود بخود فطری عمل کے تحت مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ بے شمار تجربے کیے گئے کہ اس تابکاری کا سبب کیا ہے' مگر ہر تجربہ ناکام رہا۔ ہم کو آج تک نہیں معلوم کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے میں کوئی خاص الیکٹران جب اپنے ایٹمی نظام سے ٹوٹ کر نکلتا ہے تو اس کا سبب کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کی توجیہہ میں سائنس نے بہت سے نظریے قائم کیے ہیں۔ مگر ایک سائنس دان اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ مقناطیس لوہے کو کیوں اپنی طرف کھینچتا ہے' شاید اس لیے کہ اس کے خالق نے

اس کو یہی حکم دیا ہے!

سائنس کے تحقیقی مطالعہ کے بعد اب یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ Law of Causation (قانونِ علت) اِن معنوں میں کوئی مطلق حقیقت نہیں ہے' جیسا کہ انیسویں صدی میں فرض کر لیا گیا تھا۔ ایک بہت بڑے یورپی مفکر کا قول ہے کہ ''اس دنیا کا نظام محض اتفاقی طور پر وجود میں آ جانے والے کسی علت و معلول (Cause and Effect) کے قانون کے تحت نہیں چل رہا ہے' بلکہ اس کے پیچھے ایک شعوری ذہن ہے جو بالا رادہ اس کو چلا رہا ہے۔ سائنس کی یہ واپسی مذہب کی صداقت کا ایک ایسا واضح ثبوت ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے کسی باشعور خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں' کیونکہ جدید مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی صرف تین مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے' یعنی: Reproduction, Variation and Differential Survival کہ توالد و تناسل کے ذریعے مزید زندگیوں کا ظہور' پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فرقوں کا پشت ہا پشت میں ترقی کر کے مکمل ہو جانا۔ اس کی بنا پر مخالفینِ مذہب نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ ڈارون کے انتخابِ طبیعی کے اُصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشوونما پر خُدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کر دیا جائے۔ ارتقاء پسند اہل علم کا یہ نظریہ ابھی تک غیر ثابت شدہ ہے' لیکن اسے اگر بلا بحث مان بھی لیا جائے تو اسے ہم خُدائی تخلیق کا طریقۂ کار کہہ سکتے ہیں نہ کہ اندھے بہرے مادے کا عمل۔ اس سلسلے میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مشینی ارتقاء (Mechanical Evolution) کو آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جا سکتا ہے' اور سائنس کے حوالے سے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوگی' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں پہنچ کر اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔ آج جبکہ نیوٹن کی جگہ آئن سٹائن نے لے لی ہے اور پلانک اور رہلیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کر دیا ہے' مخالفینِ مذہب کے لیے کم از کم علمی بنیاد پر اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ''نظریۂ اضافیت'' (Relativity) اور نظریۂ مقادیر برقیات (Quantum Theory) نے

خود سائنس دانوں کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (observer) کو مشاہدہ (observed) سے الگ کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں' اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ گویا بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب آیا ہے اُس نے سائنسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کر دی ہے۔

سائنس کے اندر اس انقلاب سے میری مراد یہ ہے کہ نیوٹن کا نظریہ جو دو سو سال تک سائنس کی دنیا پر حکمران رہا' وہ جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ سامنے نہیں آ سکا ہے' مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو پچھلے نظریے کے تھے۔ اب یہ دعویٰ نہیں رہا کہ سائنٹیفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد صحیح طریقہ ہے۔ اب سائنس کے ممتاز علماء یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

> "Science gives us but a partial knowledge of reality."

یعنی سائنس ہم کو صداقت کا جزوی علم دیتی ہے۔

بہرحال یہ ایک سوال ہے کہ کائنات کی آخری ماہیت کیا ہے؟ کیا اس میں قوانین کی کارفرمائی محض مادے کے ذاتی عمل کے طور پر ہے یا کوئی Designer یا Controlling Power یعنی خُدا ہے جس نے اس کائنات کو بالارادہ تخلیق کیا ہے؟ جیسے کسی مشین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے' یعنی لوہے اور پٹرول نے ازخود کسی اندھے عمل کے ذریعہ محض اتفاق سے مشین کی صورت اختیار کر لی ہے یا یہ کہ یہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجینئر کا ذہن ہے؟ یعنی مشین سے پہلے ایک پورا ذہن تھا جس نے مادے سے الگ اس کے ڈیزائن کو سوچا اور بالارادہ اسے تیار کیا۔

ذہن کے تعین میں اختلاف کے حوالے سے مختلف گروہ ہو سکتے ہے۔ جیسے خُدا کو ماننے والے خُدا کو ماننے کے باوجود مختلف گروہوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ فکری و علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت "ذہن" ہے' یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق ہے اور الحاد کی تردید اور سائنسی رجحان میں اسی تبدیلی کو مدنظر رکھ کر مارٹن وائٹ نے کہا تھا کہ بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنس دانوں نے ایک نئی صلیبی جنگ (crusade) کا آغاز کر دیا ہے جس میں وہائٹ ہیڈ' ایڈنگٹن اور جیمز جینز کے نام خاص طور پر

قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی الفرڈ نارتھ وہائٹ ہیڈ (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۷ء) کے نزدیک جدید معلومات یہ ثابت کرتی ہیں کہ ''.Nature is alive''۔ یعنی فطرت بے روح مادہ نہیں' بلکہ زندہ فطرت ہے۔ انگریز ماہر فلکیات سرآرتھرایڈنگٹن نے موجودہ سائنس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''.The stuff of the world is mind stuff'' یعنی کائنات کا مادہ ایک شے ذہنی ہے۔ ریاضیاتی طبیعیات کا انگریز عالم سر جیمز جینز جدید تحقیقات کی تعبیر اِن الفاظ میں کرتا ہے:

"The universe is a universe of thought."

موجودہ سائنس کے اندر یہ بہت بڑی اور عظیم تبدیلی ہے جسے جے ڈبلیو این سولیون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''The Limitation of Science'' کے صفحہ ۱۳۸ تا ۱۵۰ پر وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ انتہائی مستند سائنس دانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ موصوف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"The ultimate nature of the universe is mind."

اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لیے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے' بلکہ یہ تبدیلی وہ ہے جو اِس کی مابعد الطبیعیاتی بنیادوں (Metaphysical Foundations) میں واقع ہوئی ہے۔ گویا کہ اسی ترقی نے مذہب کے موقف کو جدید سائنٹیفک انداز سے واضح کیا ہے۔ علمی اعتبار سے اتنی بڑی اور اہم بلکہ انقلابی تبدیلی واقع ہونے کے باوجود اس نئی فکر کو سائنس دانوں اور فلاسفہ کے حلقوں میں بہت کم پذیرائی ملی ہے اور انہوں نے ابھی تک اپنی قدیم فکر کو ایک شے مقدس سمجھ کر بغیر دلائل کے اس کے ساتھ رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ اس کی واضح اور صاف وجہ تعصب ہے اور انسانی تاریخ اس قسم کے بھونڈے رویّوں سے بھری پڑی ہے کہ حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے باوجود انسان نے محض اس لیے اس کو قبول نہیں کیا کہ تعصب اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

چار سو برس پہلے اٹلی کے علماء نے ارسطو کے مقابلے میں گلیلیو کے نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا' حالانکہ لیننگ ٹاور سے گرنے والے گولے اس کے نظریے کو آنکھوں دیکھی حقیقت بنا چکے تھے۔ پھر یہی تعصب تھا جب انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max plank) نے روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے متعلق نیوٹن کے تصور کو غلط ثابت کر رہی تھیں' تو وقت کے ماہرین نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور

عرصہ تک اس کا مذاق اڑاتے رہے' حالانکہ آج یہ Quantum Theory کی صورت میں علم طبیعیات کے اہم اُصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ تعصب سائنس دانوں میں نہیں ہو سکتا تو اس کی اطلاع کے لیے میں ڈاکٹر ہلز کا یہ قول پیش کرتا ہوں جو اے این گیلکس (A.N. Gilkes) نے اپنی کتاب "Faith For Modern Man" کے صفحہ ۱۰۹ پر نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر ہلز کہتے ہیں:

"I should be the last to claim that we scientific men are less liable to prejudice than other educated men."

یعنی میں آخری شخص ہوں گا جو اِس بات کا دعویٰ کرے کہ ہم سائنس دان دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں میں کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اب انسانی تاریخ کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ علمی اور منطقی طور پر عقل ہی کو بلند مقام حاصل ہے' مگر اکثر معاملات میں ایسا ہوا ہے کہ عقل خود جذبات کی آلۂ کار رہی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ عقل نے جذبات کو قابو کر کے اس سے ایک بہتر کام لیا ہو۔ اسی رویے کے بارے میں جو حتمی بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص پر باہر سے کوئی بات نہیں منوا سکتے جب تک اُس بات کے ماننے کے لیے اس کے اندر از خود آمادگی پیدا نہ ہو چکی ہو۔ اور اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کتابِ ہدایت کے الفاظِ مبارکہ کہ قرآن ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' ہے' یعنی یہ قرآن ہدایت کا ذریعہ اُن لوگوں کے حق میں بن سکتا ہے جن کے اندر اِس ہدایت کو قبول کرنے پر آمادگی پیدا ہو چکی ہو۔

حل کیا ہے؟

دنیا میں فکر و عمل کا جو انقلاب آیا ہے ایک لمبی مدت گزرنے کے باوجود ہمارے علماء اس سے بے خبر ہیں کہ اس وقت فی الواقع جدید مسئلہ کیا ہے؟ بلکہ ہمارے علماء مغربی افکار کو سرے سے جانتے ہی نہیں۔ مدارس اور دار العلوم چلانا' تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کے ایک قدیم نظام سے وابستہ رہنا' تقریر و تحریر کی صورت میں اپنے آپ کو اسلامی سرگرمیوں میں مشغول رکھنا' فتوے دینا' خطابت اور امامت کے اُمور سرانجام دینا' مناظرے کرنا' جنازے اور نکاح پڑھانا' یہ سارے اُمور اپنی جگہ اہم اور ضروری ہیں' لیکن فکری اور علمی سطح پر شیطانی فلسفوں اور ملحدانہ افکار و نظریات کا توڑ کرنا اور اُسے دلیل سے رد کرنا اہلِ علم کا اوّلین فریضہ

تھا' مگر اس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔

ایک دَور وہ تھا جب یونان کا فکر و فلسفہ اور تصوّف اسلام کے لیے چیلنج بن کر آیا تھا' تو امام ابن تیمیہؒ نے ''الردّ علی المنطقیین'' کے ذریعے اور امام غزالیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تھافۃ الفلاسفۃ'' کے ذریعے یونانی فکر و فلسفہ کے تار و پود بکھیر دیے تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ دَورِ جدید کے اتنے بڑے وسائل اور ذرائع کے ہوتے ہوئے بھی ہم مغربی فکر و فلسفہ کے توڑ کے لیے کچھ نہ کر سکے جو جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے لازمی اور ضروری تھا۔ ہمارے اس عمل پر البرٹ ہورانی کا یہ تبصرہ بالکل صادق آتا ہے کہ:

"Most of the writings of Islam by Muslims are not on the level of current thought."

یعنی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بیشتر اسلامی تحریریں عصری فکر کی ہم سطح نہیں ہیں۔ ہمارے علماءِ دین ایک طرف جدید علوم سے نابلد رہے اور دوسری طرف انہوں نے کچھ فرمودات نبوی ﷺ جیسے ((لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا)) اور ((حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ)) اور ((مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ)) کا مطلب یہ لیا کہ اسلام ایک جامد اور محدود نظریۂ حیات ہے اور کتاب و سنت کی صحیح تعبیر و تشریح وہی ہو سکتی ہے جو متقدمین علماء نے کی تھی۔ لہٰذا اُن کے لیے ناممکن ہو گیا کہ ایسی علمی صداقتوں کو اپنا سکیں جو نزولِ قرآن کے زمانہ کے بعد دریافت ہوئی تھیں یا جن کے دریافت کرنے والے غیر مسلم تھے اور وہ لفظی اعتبار سے تو قرآن میں نہیں تھیں مگر معناً قرآن کے اندر موجود تھیں اور قرآن کی روح سے مطابقت رکھتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علماء اُس سیدھی شاہراہ سے ہٹ گئے جس پر خود چلنے اور اُمت کو چلانے کی ذمہ داری اُن کے سپرد ہوئی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ازالہ کس طرح ہوگا؟ یا اس کا حل کیا ہے؟ جان لینا چاہیے کہ اسلام کو دوبارہ عروج کی طرف مائل کرنے کا طریق کار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم بشدّت تمام قرآن کی روح سے وابستہ رہتے ہوئے مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید کریں۔ اگر ہماری تردید علمی اور عقلی لحاظ سے فی الواقع درست اور کامیاب ہوگی تو رفتہ رفتہ اِن غلط تصورات کا اثر بالکل زائل ہو کر شاکلۂ انسانی دوبارہ ہدایت کی طرف پلٹا کھائے گا۔

ویسے اِن تمام فلسفوں کی تردید اجمالی طور پر قرآن میں موجود ہے جو قیامت تک پیدا

ہوتے رہیں گے۔ لیکن ہم محض قرآن کی عبارتوں کو نقل کر کے اغیار کو قائل نہیں کر سکتے' بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر غلط فلسفہ کے بارے میں قرآن کے موقف کو جدید' معیاری' علمی اور عقلی استدلال کا جامہ پہنائیں۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ ہم Philosophy, Biology, Physics اور Psychology کے اُن تمام قدیم و جدید حقائق کو مضمراتِ قرآن میں شمار کریں جو روحِ قرآن کی تائید کرتے ہیں یا اُس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ حدیث نبوی ﷺ ہے: ((اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا)) (سنن الترمذی' کتاب العلم عن رسول اللہ ﷺ' باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ ۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب الحکمۃ) ''حکیمانہ بات مؤمن کی گمشدہ متاع ہے اور وہ زیادہ حق دار ہے کہ وہ اُسے اُٹھا لے جہاں سے بھی اُسے ملے''۔ گویا ہمارے لیے کرنے کا اوّلین کام یہ ہے کہ فلسفۂ مغرب اور افکارِ مغرب کے توڑ کے لیے ہم قرآن واحادیث کے مطالب اور معانی کو ایک عقلی سلسلہ میں مربوط کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس لیے کہ اسلام کی بنیاد محکم حقائق پر ہے جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اپنی موجودہ صورت میں مفروضات پر قائم ہیں۔ لہٰذا جب مغربی علماء نے قرآن اور بائبل کی علمی اور عقلی جانچ پرکھ کی تو تاریخی اعتبار سے بائبل ایک غیر معتبر کتاب قرار پائی۔ جبکہ اس علمی تحقیق نے قرآن کے بارے میں یہ رائے دی کہ قرآن کو مکمل طور پر تاریخی اعتباریت (Historical Credibility) حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے نظریۂ حیات کے ممکنات کے اندر اس بات کی واضح شہادت موجود ہے کہ ہم مسلمان عنقریب خُدا کے تصور کو سائنس سے متحد کر کے مستقبل کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کی قیادت کریں گے جس کو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ''قرآن اور علمِ جدید'' میں بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ:

> ''ایسا وقت ضرور آئے گا جب قرآن کے مطالب اپنی تفصیلات اور جُزئیات کی فراوانی کی وجہ سے ایک نظامِ حکمت کی صورت اختیار کریں گے اور معلوم حقائق کے ساتھ ایک عقلی ترتیب میں آ کر اس قدر واضح اور روشن ہو جائیں گے کہ کوئی شخص قرآن کی صداقت سے انکار نہ کر سکے گا''۔

قرآن نے اس کی پیشین گوئی یوں کی ہے:

﴿سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ۭ﴾

(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''عنقریب ہم اُن کو اطراف عالم میں اور خود ان کے اپنے اندر بھی نشانیاں دکھائیں گے' یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے''۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ایک اچھی حکمت عملی اور پیش بندی کا تقاضا ہے کہ فوری طور پر ایسے علمی اور تحقیقی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں اس بے خُدا سائنس کی بنیاد پر پیش آنے والے اس علمی چیلنج کے بارے میں معلوم کیا جائے کہ اس کے عناصر اربعہ کیا ہیں اور انسانی فکر و نظر' انسانی اقدار اور علوم و فنون پر اس کے اثرات کیا ہیں۔ جہاں طلبہ کو وہ اساتذۂ کرام جو قرآن و حدیث کے مزاج اور روحِ عصر کے تقاضوں سے باخبر ہوں' ایک ایسا جاندار نصاب پڑھائیں جو چند سالوں میں اُنہیں اس قابل بنائے کہ وہ قرآن و حدیث کی اعلیٰ علمی سطح پر دورِ جدید کے اس علمی چیلنج کا جواب دے سکیں' جہاں سے طالب علم کتاب خواں نہیں بلکہ صاحبِ کتاب بن کر نکلے' جہاں علم کی موجیں طالب علم کو خاموش نہیں بلکہ کشمکشِ حیات سے باخبر اور ٹکر لینے کے لیے بے تاب بنا دیں۔ بقول اقبال:

خُدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے' مگر صاحبِ کتاب نہیں!

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 20 روپے اشاعت عام: 12 روپے